eISSN:2073-3674
pISSN:1991-7813

OPEN ACCESS

"آدھے ادھورے خواب": عصری سیاسی تناظر میں

An Analytical Study of "Adhay Udhooray Khwab" in Contemporary Political Context

خالد محمود، پی ایچ ڈی سکالر، نمل، اسلام آباد
Khalid Mahmood,PhD Scholar, NUML, Islamabad
ڈاکٹر عابد حسین سیال، صدر شعبہ پاکستانی زبانیں، نمل، اسلام آباد
Dr Abid Hussain Sial, Head, Department of Pakistani Languages, NUML, Islamabad.

ABSTRACT
Shahid Siddiqui's novel "Adhay Udhooray Khwab" has three basic context: political, educational and social. The writer has his clear stance on the issues and has creatively embed his view in the story of the novel. He can feel the pain of the people struggling for a better future and pursuing their dreams of freedom and justice in the society. The story of the novel has a contemporary context in which social movements are on rise and political temperature of the society is very high. The article is an attempt to analyze the novel in the contexts mentioned above.
KEYWORDS: Political context, Contemporary novel, Khalid Mehmood, Abid Sial
کلیدی الفاظ: سیاسی تناظر، معاصر ناول، خالد محمود، عابد سیال

ادب ہماری زندگی کی اعلیٰ ترین دستاویز ہے اور سیاست اس کا لازمی جزو ہے۔ ادب اور سیاست انسانی معاشرے کا بنیادی حصہ ہیں۔ اس لیے تخلیق کار کے یہاں تمام موضوعات جو سیاسی ہوں از خود تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں کسی بھی خطہ انسانی کے منظّم معاشرے یا کسی ریاست کے امور کا مطالعہ علمِ سیاست ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

> "سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے جس میں ادب آزادی کے ساتھ آزادی کی فضا میں اظہار کر سکے۔ ادب آزادی کے اظہار کی ایک حقیقی

صورت ہے، آزادی کا یہی احساس فرد اور معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کا تعین کرتا ہے۔)" 1(

معاشرے اور ادب کی بنیاد انسانی فہم یا عقل پر ہے جس معاشرے میں سیاسی بیداری اور شعور قوم ہو، اسے اپنی مملکت بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ گویا سیاست اور ادب میں وہ طاقت ہے کہ اگر دونوں میں انتظامِ یکجہتی ہو جائے تو ریاست کے اعلیٰ قیام کا تصور نمودار ہوتا ہے اور حساس معاشرے کے افراد اس کی ادبی آئینہ داری میں پیش پیش ہوں گے ،اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے:

"تخلیق کار معاشرے کا فرد ہوتا ہے اس لیے وہ اجتماعی شعور سے لاتعلق نہیں رہ سکتا اور اسے شعوری طور پر اس کا احساس ہو یا نہ ہو وہ قوم کی سائیکی کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتا)" 2(

ادیب انسانی روپ کا ترجمان ہوتا ہے، سماج کو سماوی فوائد پہنچانے والے لوگ بھی ادیب کے حساس رویوں سے متاثر ہوتے ہیں ،یہی وہ خاص فضا ہے جس میں ادیب کا دماغ کلّی سوچ کا جواز سامنے لاتا ہے اور اس میں معاشرتی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ادیب جس مرض کے تشخص کے لیے کس اوزار کا استعمال کرتا ہے وہ دراصل ادب ہی تو ہے۔ ادیب مختلف اصنافِ ادب کی شکل میں اس کا اظہار کرتا ہے، اس کا کچھ اظہار شاعری میں ہے اور کچھ نثری ادب کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ شاہد صدیقی کے ناول "آدھے ادھورے خواب" میں بھی ادیب نے اس ادبی سیاسی منظر نامے کو جس مہارت اور فنی صلاحیت کے دم سے تعبیر کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

اکیسویں صدی جس سیاسی اور ادبی شعور سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے وہ جدید سائنس، مغربی تاثرات اور تحریری سحر خیزی سے ممکن ہے اور یہاں سیاسی شعور کی بلوغت اپنے عروج پر ہے اور ادب محض علاماتی صورت میں نہیں ہے بلکہ عالمی سطح کے مباحث بھی ناول کا حصہ بن چکے ہیں جس میں روس، لندن اور امریکہ کے بڑے قلم کار شامل ہیں۔ ادبی سوجھ بوجھ دراصل معاشرتی بیداری سے امکان آور ہوتی ہے۔ حساسیّت کی رُو انسانی دماغ میں بجلی کی طرح سفر کرتی ہے اور ادیب اس بجلی کی روشنی میں معاشرتی نقص کو سیاسی تدبّر سے لفظی پیکر میں ڈھالتا ہے۔ یہی ادب دراصل ادیب کی معاشرتی بیداری کا بیّن ثبوت ہے۔ معاشرے کی وہ حقیقتیں جو اپنی گرہ کُشائی کے لیے غور و فکر کی متقاضی ہیں انہیں صرف سیاسی اور سماجی تجزیے سے پوری طرح گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان حقائق کو محسوس کرنے کے لیے جو بنیادی صنفِ ادب کی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ ناول ہے۔

شاہد صدیقی کے ناول میں فکری اشتراک کی بنیاد سماجی برابری، انصاف اور آزادی کے خواب سے مکمل ہے اور خواب جو آزادی کے حصول میں اپنی جان سے کھو جانے سے تکمیل پاتے ہیں، تو ادب اور سیاست یک جان ہو جاتے ہیں اور نئی راہ مہیا کرتے ہیں۔ اس سماجی ناہمواری، ناانصافی اور آزادی کے خلاف ذہنی ترقی کا نام ادب کے اظہار سے امکان پذیر ہے اور یہی بنیادی سبب ہے۔ اس حوالے سے محمد علی صدیقی یوں لکھتے ہیں:

> "ہمارے عہد کا لہجہ سیاسی ہے ہمیں یہ ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ ادیب ملک کے شہری کی حیثیت سے سیاست سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ادیب بنیادی طور پر ترقی پسند ہوتا ہے جس کے لیے کسی خاص پارٹی سے سند لینا یا لائسنس یافتہ ہونا ضروری نہیں۔)"3(

اگر بیسویں صدی کے ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑے فنکار کا Concern ریاست، ادارہ اور حمایت کی چیرہ دستیوں اور انسانی وجود کی سالمیت کو بچانے کا رہا ہے، فنکار ان قدروں کو تلاش کرتا ہے جو ان میں انسانی زندگی کا کھویا ہوا اعتبار اور احترام زندہ کر سکے۔ چونکہ بیسویں صدی کے فن کا المیہ جوہری توانائی کی تباہ کاریاں بھی تھا اس لیے فنکار کا عصری آگہی اور انسان دوستی کو تصور پیش کرنا نہایت فطری تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب حالات کو بدل دے گا۔ حالات سیاسی، سماجی اور فکری عوامل کا مجموعہ ہوتے ہیں، ادیب اس تقاضے کو سمجھتا ہے اور بہتر حالات کے منظر نامے سامنے لانے کے لیے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فکری کاوشوں میں اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی شامل کرتا ہے یوں ادب اور سیاست کے کنارے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سارتر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "فرانسیسی مفکر، ادیب، ژاں پال سارتر سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک ادب اور سیاست کا کیا رشتہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ سیاسی عمل کو ایک دنیا کی تعمیر کرنی چاہیئے جس میں ادب آزادی کے ساتھ اظہار کر سکے، آزادی کی یہی وہ فضا ہے جس نے فرانسیسی ادب کو دنیا کے لیے مینارہ نور بنا دیا ہے۔)"4(

کسی بھی معاشرے میں بنیادی تبدیلی کا تعلق براہ راست سیاسی اور اقتصادی نظام سے ہے۔ ایشائی ممالک چونکہ ایک طویل عرصے تک نو آبادیاتی تسلط میں رہے، اس لیے یہاں سماجی تبدیلیاں اپنے اندر سامراجی خدوخال رکھتی ہیں۔ سامراجی غلبے کے دوران میں ان ممالک میں جو ادب تخلیق ہوا اس کا رجحان نو آبادیاتی جبر کے خاتمے کا مظہر رہا ہے۔ اس رجحان کے ساتھ ساتھ خود شناسی کے عمل میں بھی شعر و ادب میں نمایاں ہوتا رہا۔ ادب زندگی سے

براہ راست اثر لیتا ہے اجتماعی ادب زندگی کی بدلتی ہوئی حالتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ برصغیر کی بگڑتی ہوئی معاشرت کو ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اس سلیقے سے بیان کرتے ہیں:

"سیاست کی بساط سے اٹھ جانا صرف ایک کمزور مغل بادشاہ کا حادثہ نہ تھا، اس کے ساتھ ایک تہذیب، ایک معاشرت، ایک تمدن کا تصور وابستہ تھا۔)"5(

اس کے برعکس اگر انقلاب فرانس کے پیچھے جن ادیبوں کی تحریروں کا بہت عمل دخل ہے اس میں روسو، والٹئیر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ فرانس کی تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ آج ہمارہ معاشرہ جن حالات سے دوچار ہے انقلابِ فرانس کے واقعات ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں، جب فکر و دانش اور اخلاقی اقدار کا زوال ہونے لگتا ہے تو پورے معاشرے میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ انتشار بہت سی نامناسب قوتوں کو اپنی کارستانیاں آزمانے کا موقع باہم پہنچاتا ہے۔ جب تک قوم غفلت میں ہوتی ہے اعلیٰ معاشرے کی تشکیل میں آزادیِ فکر کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ افراتفری، تعصب، تنگ دلی کی فضا میں انسانی تہذیب روبہ زوال رہتی ہے۔ اس لیے مطلق العنان بادشاہوں کے قواعد اور معاشرتی آداب اس کے قلم کی زد میں ہوتے ہیں۔ والٹئیر سیاسی اور مذہبی حوالوں سے برسرِ اقتدار گروہوں کے خلاف جدوجہد میں مصروفِ عمل رہا اور اپنے عہد کے افراد اور واقعات کو بھی زیرِ بحث لاتا رہا۔

انقلاب فرانس سے کچھ پہلے کنڈورست نے والٹیئر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

"یورپ میں عقل اور انسانیت کے نام پر آنے والی تبدیلیوں کی تاریخ اصل میں والٹیئر کی تحریروں اور اس کی فیض رسانی کی تاریخ ہے۔ اگر سماج کے بالائی طبقوں میں تعصب ختم ہو گیا اور عام لوگوں میں اس کا زور پہلے سا نہ رہا، اگر انسان کی محبت تمام حکومتوں کی زبان بن گئی، اگر جنگیں پہلے سے کم ہو گئیں، اب اگر کوئی بھی شخص بادشاہوں کے تکبر یا دعوؤں کو پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتا تو جن کو وقت جنگ کے حیلوں بہانوں کے طور پر رد کر چکا ہے، اگر ہم ان تمام فریب کاریوں کا زوال دیکھ چکے ہیں، جن کے پردے میں سراعت یافتہ طبقہ بنی نوع انسان کو فریب دیتا ہے، اگر پہلی بار عقل یورپ کی اقوام پر ایک مستحکم روشنی ڈالنے لگی ہے تو پھر آپ کو ہر جگہ ان تبدیلیوں کی تاریخ والٹیئر کے نام سے ملے گی۔)"6(

اس سارے منظر کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ جس متعصبانہ روش پر چل رہا تھا، وہاں کی آمد نے نیا رستہ دریافت کیا اور شعورِ قوم کو بیدار کرتے ہوئے

آزادی جیسے حقِ رائے دہندگی عوامی حقوق کی شکل میں ادبی فضا میں تبدیلی پیدا کر دی۔ فی زمانہ یہی ہوتا رہا ہے کہ عقل نسل در نسل سفر کرتی ہوئی آگے بڑھی ہے اور معاشرے کی تربیت میں اہم اور ضروری کردار ادا کرتی رہتی ہے۔ صنفِ ادب میں ناول اور آزادی کے تصور کو استاد جیسے عظیم کردار کی بدولت پیش کرنے میں شاہد صدیقی نے جس مہارتِ تخلیق سے کام لیا ہے وہ اہمیت طلب ہے۔ گذشتہ گفتگو میں بات یہاں تک بہ آسانی پہنچ آئی کہ ادب اور سیاست میں جن بنیادی مباحث کو دخل ہے وہ سماجی ناہمواری، ناانصافی اور فکری انتشار کے سبب پیدا ہونے والی متعصبانہ روشِ زندگی ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار پروفیسر سہارن کا ہے جو اپنے نظریات اور پڑھانے کے انداز سے طلبہ میں مشہور ہیں۔

اس ناول میں محبت شخصی نہیں بلکہ اعلیٰ وارفع مقصدیت کی بنیاد پر منتج ہے امتسال آغا پروفیسر سہارن رائے کے استادانہ رویے سے متاثر ہو کر کسی گاؤں میں پڑھانے لگ جاتی ہے۔ اس ناول میں جس سیاسی تناظر کا ذکر ملتا ہے وہ ''عدلیہ بحالی تحریک'' ہے۔ اس ''عدلیہ بحالی تحریک'' کی صورت میں میڈیا، وکلاء اور سول سوسائٹی کا جو کردار ہمارے سامنے آیا ہے اُس نے ثابت کیا ہے کہ ہمارا ناول تصوراتی، تخیلاتی میلانات سے بہت آگے نکل آیا ہے اور حقیقت نگاری کے نقوش اس عہدِ موجود پر ثبت کر رہا ہے۔

پروفیسر کا کردار انتہائی اعلیٰ علامت ہے کہ معاشرہ کس طرح سیاست اور ادب سے ہم آہنگ ہو رہا ہے اور کس طرح اعلیٰ دماغ علم اور ادب کے حسین امتزاج سے مُزین ہے۔ یہ ناول اس نوعیت میں واحد ہے، شاہد صدیقی نے تعلیم اور فلسفہ تعلیم کی موشگافیوں کو نہایت اعلیٰ سلیقے اور فنی پختگی کے ساتھ ناول کی شکل میں ڈھالا ہے۔ کہیں کہیں اس ناول پر آپ بیتی کا گماں ہوتا ہے کیونکہ شاہد صدیقی خود ماہر تعلیم ہیں اور طلبہ کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں، اور ایک استاد کا سیاسی بہاؤ میں رہنا اور سیاست دانی کے تصورات پر اپنی شخصیت کا عکس دکھانا بھی اس بات کا غماز ہے کہ معاشرہ تعلیم معاشرت اور ادب سے جڑا ہوا ہے اور اس کے مصلح اور اس کے باقاعدہ اس عمل کا حصہ ہوتے ہیں، جو معاشرتی تخریب میں تعمیر کا پہلو ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاہد صدیقی نے اپنے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' میں استاد اور طلبہ کے بارے میں یوں اظہار کیا ہے:

> ''ٹیچنگ میرا محبوب پروفیشن ہے، میں اسے تخلیقی کام سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے طلبہ بہترین مصنف ہوتے ہیں وہ جلد ہی استاد کا جائزہ لے کر ایک نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ استاد کی شہرت کلاس روم سے جنم لیتی ہے۔)''7(

یہ وہ تعمیری پہلو ہے جو استاد کا ایک شاندار معاشرہ ترتیب دینے میں سامنے آتا ہے۔ایک اور مقام پر اسی جملے کی گونج سنائی دیتی ہے،

"ایک اچھا استاد تخلیق کار ہوتا ہے، ہر سوچ ہم سے تخلیق کے نئے زاویے مانگتی ہے۔کائنات کی تفہیم کا جداگانہ انداز چاہتی ہے۔)"8(

اس ناول میں استاد کو جس اہم ذمہ داری سے متعارف اور روشناس کروایا گیا ہے اس میں وہ تمام جذبے اور حقائق شامل ہیں جن کو نہایت عمدہ سلوک سے معاشرے میں داخل کیا جا سکتا ہے۔استاد کی سوچ معاشرے کی شکل اختیار کرتی ہے، کائنات کی تفہیم کے دروازے علم کی بدولت کھلا کرتے ہیں اور اس سارے عمل میں جو شخص ایک سوسائٹی اور معاشرے کا رہنما ہوتا ہے وہ محض استاد ہے۔یہی سبب ہے کہ اگر استاد کی سوچ کے زاویے درست سمت میں ہوں گے تو معاشرہ سیاسی، سماجی لحاظ سے توازن میں رہے گا وگرنہ جس محرومی نے استاد کی شخصیت میں جگہ بنا رکھی ہو گی وہ پہلو نئے فرد کا ذہنی معیار بن کر معاشرے کے لیے بگاڑ بن جائے گا۔شاہد صدیقی رقم طراز ہیں:

"ہمارے معاشرے کا بڑا مسئلہ معاشی عدم مساوات ہے جس کو کم کرنے کے لیے صرف سکولوں پر دارومدار غیر دانشمندانہ ہے اس لیے ہمیں سکول اور دوسرے معاشرتی اداروں کے درمیان رابطے کرنا ہوں گے۔)"9(

اس صورت حال کا نقشہ واضح ہے کہ تعلیم ان افراد کا زیور بنا دی جائے جنھیں معاشرتی اداروں میں کام کرنا ہے۔معاشرتی اداروں سے مراد وہ تمام ادارے ہیں جنھیں عوام الناس کی بہتری اور کامیابی کے لیے حکومتی اقدامات کی بدولت کام کرنا چاہے وہ عدالت ہو، سیاست ہو، الغرض کوئی بھی ہو لیکن ان سب اداروں کو یکجا ہو کر دانشمندانہ اقدام اٹھانا ہوں گے تاکہ اس درمیانی خلا کو مکمل کیا جائے اور ایک خاص ہموار قسم کی آب و ہوا پورے معاشرے کو میسر آسکے۔ظاہر ہے سیاسی، عدالتی عدم استحکام کے نتیجے میں رشوت، سفارش ،لاقانونیت،عدم تحفظ، خوف، غربت، دہشت گردی اور فکری بانجھ پن جیسے عوارض معاشرتی تشخص کو مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ایسے سیاسی و سماجی منظر نامے کے بارے میں ارشد محمود یہ رائے رکھتے ہیں:

"آج پاکستان کا ہر شہری اپنے ملک کی موجودہ حالت پر تشویش کا شکار ہے اور اس کا اپنے ملک کے مستقبل سے اعتماد اٹھ رہا ہے۔ہماری قومی اور سماجی زندگی کا کوئی بھی حصہ قابلِ فخر حالت میں نہیں ہے۔)"10(

یہ وہ سخت حقائق ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، معاشرہ اپنی سماجی اور اخلاقی گراوٹ کی انتہا پر ہے۔ اس ناہمواری برتاؤ نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے جو کسی طرح بھی اس ناہمواری کو دور نہیں کر سکتی۔ طبقاتی ناہمواری نے ذہنی پرورش کو محصور کر دیا ہے۔ لوگوں میں اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کی لگن بھی ختم ہو گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہی تو خرابی ہے ہم ہر ناانصافی سہتے سہتے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہم مزاحمت کیوں نہیں کرتے، آواز کیوں نہیں اٹھاتے، کیا سارے آرام باثروت لوگوں کے لیے ہیں؟" (11)

ایک اور جگہ اسی ناہمواری کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"معاشرے کے طاقت ور طبقے نہیں چاہتے کہ معاشی اور سماجی ناہمواریاں کم ہوں، ایسا ہونے سے ان کی اپنی پاور بیس خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تعلیمی ادارے معاشی اداروں سے سماجی فرق کو کم کرنے کی بجائے اور بڑھا رہے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے غریبوں کے بچے بھی اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے تھے لیکن آنے والے دنوں میں شاید ایسا ممکن نہ ہو۔" (12)

شاہد صدیقی طبقاتی شعور سے واقف ہے اور فلسفہ تعلیم کی ترویج میں کوشاں ہے کہ ہمارے معاشرے کی اصلاح میں جس بنیادی پہلو کی ضرورت ہے وہ دراصل معاشرے کے تمام اداروں کے درمیان ہم آہنگی ہے۔ نسلی تفاخر اور تکبّر ذات کا کوئی پہلو کسی بھی قوم یا معاشرے کو بڑا نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ناول نگار اس تسلط پر بھی واضح لکھ رہا ہے کہ امراء اور غربا کے بچے آئندہ کبھی برابر کی صفوں میں نہیں آ سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امیر غریب ہونا از خود ایک واضح فرق ہے جسے اب بہت اہمیت دی جا رہی ہے جو معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ چوں کہ اس طرح کے معاشرے میں عدل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور معاشرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہوتا ہے۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"شہر کی سول سوسائٹی متحرک ہو چکی تھی۔ ہر جمعرات کو شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر وکیلوں کے جلوس کے ہمراہ طلبہ، اساتذہ، سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں۔ میں باقاعدگی سے ریلی میں شامل ہوتا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں پلے کارڈ ہوتے جن میں عدلیہ کی بحالی کے نعرے درج ہوتے۔ سردی، گرمی، آندھی، طوفان، بارش۔ کوئی جمعرات ایسی نہیں تھی کہ ریلی برآمد نہ ہوئی ہو۔" (13)

یہ اقتباس واضح طور سے بیان کر رہا ہے کہ انصاف کے طلب گار لوگوں میں عدلیہ کی بحالی ہر ممکن ضروری ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انصاف محض انسانوں کے کسی خاص گروہ کے لیے مختص ہو، نہیں ہر گز نہیں۔ عدل کی بنیاد پر ہر معاشرہ مستحکم ہوتا ہے۔ اس سارے سیاسی منظر نامے میں سماجی اور معاشرتی مسائل نے بڑی تیزی سے جڑ پکڑی اور نتیجتاً ہر مکتب فکر کے لوگ اس احتجاجی ریلی میں شریک ہوئے۔ طلبا، اساتذہ، وکیل اور سول سوسائٹی کے لوگ اسے طاقت ور بنانے کے لیے کسی موسم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا حصہ بنے رہتے تاکہ انصاف کے حصول میں کوئی کوتاہی نہ برتی جائے۔ ان حالات کو بہتر بنانے کے لیے فلسفۂ تعلیم سے منسلک لوگ سامنے آئے اور معاشرے کی اصلاح میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ منزل کے حصول کی کوشش محنت کو آسان بنا دیتی ہے۔ موسم کی شدت کبھی سامنے نہیں آتی۔ حالات کسی بھی قسم کے ہوں کبھی مخالف نہیں ہوتے، جو کوشش کرتا ہے پالیتا ہے اور کامیابی سخت محنت طلب کرتی ہے، جسے آگے آنا ہوتا ہے اسے سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک اور جگہ اسی فکر کے تناظر میں تحریر کیے گیے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر سہارن رائے اپنے بارے میں کیا بات کرتا ہے اس کی گفتگو اپنی پرانی دوست سے ہوتی ہے اور اس کی دوست شمائل اسے کہتی ہے:

> ''کہتے ہیں سارن جیل کی چار دیواری کے باہر لوگوں نے انقلاب زندہ باد کے نعرے صاف سنے۔ یہ عین وہی وقت تھا جب بھگت سنگھ کو پھانسی گھاٹ کی طرف لایا جارہا تھا۔''   ''شمائل! کہاں بھگت سنگھ اور کہاں میں۔ بس اپنی سی کوشش ہے۔ میرا میدان تعلیم ہے اور میں سمجھتا ہوں معاشرے میں تبدیلی کا یہ ایک مؤثر ہتھیار ہو سکتا ہے۔)''14(

اس سارے مکالمے کے اندر تعلیم اور فلسفۂ آزادی کے تناظر میں بحث ہے اور شمائل جو اس کی پرانی دوست ہے۔ اسے پروفیسر کے بارے میں پتا ہے کہ وہ کس طبیعت کا آدمی ہے۔ چوں کہ دونوں کی ملاقات ریلی میں ہوئی تو اس حوالے سے دونوں نے ایک دوسرے سے بات کی۔ ''بھگت سنگھ کی پھانسی'' کا ذکر اور ''میرا میدان تعلیم ہے'' اتنے اہم جملے ہیں کہ اگر ان پر گہرائی سے سوچا جائے تو علم ہوتا ہے کہ تعلیم واحد ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم لوگ ذہنی غلامی اور معاشرتی ناہمواری سے باہر نکل سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ معاشرہ مادیت پرست ہے اس لیے اس میں بکنے اور خریدے جانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ جس کے سبب سارے معاشرے کو نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس کا اظہار شاہد صدیقی نے یوں کیا:

> ''ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ہے۔

ملک کے ذہین اور بزرگ وکیل آمریت کے ساتھ بن گئے ہیں۔ یہ ذہین اور بزرگ وکیل ہر دور میں غیر جمہوری حکومتوں کا حصہ رہے ہیں۔ تحریک جواں عزم وکیل رہنماؤں کی سربراہی میں آگے بڑھ رہی ہے۔اس کے ساتھ ہی حکومتی جبر کے ضابطے بھی حرکت میں آرہے ہیں۔میرے ایک شاگرد نے جو آج کل پولیس میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے، فون کیا ہے اور مجھے محتاط رہنے کو کہا ہے۔"

سر! براہ مہربانی آپ محتاط رہیں میں نے آپ کا نام اس فہرست میں دیکھا ہے جو حکومت کا پہلا نشانہ ہوں گے۔)"15(

مصنف نے کس خوفناک تصور سے روشناس کرایا ہے کہ قریب کے لوگ اگر ریلی سے نکل کر حکومتی آمرانہ ذہنوں سے مل جائیں تو فضا ایک دم کس طرح مخالف ہو گی اور حیرت کا تقاضا یہ ہو گا کہ اعتماد کہاں کیا جائے اور حکومت کی معاونت کرتے ہوئے وکلا اس بات سے بالکل باخبر ہیں کہ کس کروٹ معاشرہ سفر کرے گا لیکن یہ سارا کچھ بے سود بے کار ہے۔ اب تحریک میں شامل تمام لوگوں کو فون کالز آرہی ہیں کہ اس تحریک سے پیچھے رہیں، فہرستیں مکمل ہو گئی ہیں اور پولیس افسران ان لوگوں کو دھرنے کے لیے اپنی اپنی ٹیمیں تشکیل دے رہے ہیں جس میں پروفیسر سہارن کو مطلع کیا جا چکا ہے کہ اس عمل سے محتاط رہیں وگرنہ حالات آپ کے حق میں بہتر نہیں ہیں اور حکومت ان تمام لوگوں کو نشانۂ عبرت بنا دے گی۔ لیکن تحرک لوگوں میں ایک خاص تعلق اس نظریے کی وجہ سے ہوتا ہے جو انھیں مسلسل جوڑے رکھتا ہے۔ اسی لیے پروفیسر کو یونیورسٹی میں ایک سٹوڈنٹ کا فون آتا ہے اور شاہد صدیقی اس مکالمے کو اس انداز سے تحریر کرتے ہیں:

"سر آپ کیسے ہیں؟موومنٹ کیسی جارہی ہے؟

میں نے بتایا"یہاں تحریک پورے جوش و خروش سے جاری ہے اور وہاں کے حالات کیسے ہیں؟

"سر یہاں لیڈرشپ کی کمی ہے لیکن ہم سول سوسائٹی کے لوگ وکیلوں کے ہمراہ احتجاج میں برابر شریک ہوئے ہیں" اور کالج کا کیا حال ہے" میں نے پوچھا۔" سر کالج کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ کریٹیکل تھینکنگ CRITICAL) (THINKINGاور سوشل چینج(SOCIAL CHANGE)کی باتیں محض کتابی ہیں۔ کالج کے اساتذہ تو ملکی حالات اور عدلیہ بحالی تحاریک کا ذکر کرنا

بھی پسند نہیں کرتے" بینش ملکی حالات اور کالج کے اساتذہ کی بے حسی سے دل گرفتہ تھی۔"(16)

جہاں لیڈر شپ کمزور ہو گی، احساسات میں تصنع پایا جاتا ہو گا، خیالات میں ذاتی اقتصادی کوششیں کارفرما ہوں گی اور سب سے بڑھ کر جہاں اساتذہ جنھیں بیدار دماغ تصور کیا جاتا ہے بے حسی کے نشے میں وقت کے ساتھ گزار رہے ہوں وہاں معاشرے میں کبھی نئی سوچیں پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ جہاں ملکی حالات اور عدلیہ بحالی کی تحریک کامیاب نہ ہو سکے اس ملک کے معاشرے کے بارے میں کیا تصور کیا جا سکتا۔ ایسے ماحول میں اساتذہ کا خاموش رہنا اور بے حسی کے ساتھ وقت گزارنا غلط عمل ہے جس پر تمام نئی سوچیں حیران اور دل گرفتہ ہیں۔ کیا معاشرہ صرف بڑی بڑی عمارتیں، ڈیم، سڑکوں کے جال بچھنے سے کامیاب بن سکتا ہے؟ اس حوالے سے شاہد صدیقی کی رائے ملاحظہ ہو؛

"بڑے بڑے ڈیم، کشادہ سڑکوں کے جال، بلند و بالا عمارتیں ڈیویلپمنٹ کے لیے کافی نہیں۔ جب تک لوگوں کو صحت، تعلیم، آزادی افکار اور آزادئ کار میسر نہ ہو۔"(17)

سیاست ہمارے عہد کے اجتماعی نظام کا نام ہے۔ یہ محض چند افراد کے لوٹ مار کر کے مزہ لینے کا نام نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظام میں اجتماعی زندگی کے تمام مفادات مضمر ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی تعلیم، صحت اور آزادی جیسے اہم اور بنیادی مسائل کا حق رکھتی ہے، اگر اس پر پابندی ہو جائے گی تو سارے مسائل از خود جنم لینے لگ جائیں گے۔ سیاست کا مقصد قطعی طور سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان تمام محرکات پر قابض ہو جائے جو اجتماعی زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اور ایک ایسا سامراجی ڈھانچہ تشکیل کر کے جو ایک خاص مشین کی طرح چل کر لوگوں کے مال و اسباب کو تلاش کر کے ختم کر دے، ایسی سیاست کی کوئی شکل نہیں ہوتی جس میں انسان کی ذمہ داری خارجی خواہشات، تنہائی اور محبت کی ضرورتوں کی عکاسی نہ ہو سکے۔ "آدھے ادھورے خواب" میں شاہد صدیقی اسی کیفیتِ انسانی کے علم بردار دکھائی دیتے ہیں اور یوں ناول میں پروفیسر سہارن کی زبان سے گفتگو کرتے ہیں:

"جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں طلبا یونین پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس کے بعد آنے والی تمام حکومتوں نے یہ پابندی برقرار رکھی یوں پاکستانی سیاست میں تازہ ہوا آنے کے امکانات ختم کر دیے گئے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت جاگیرداروں، زمین داروں اور صنعت کاروں یا کاروباری لوگوں پر مشتمل ہے جہاں سے تبدیلی کی توقع رکھنا ایک کارِ بے کار ہے۔ ایسے میں طالب علموں کا تحریک کے لیے جوش و

خروش جمہوریت پسندوں کے لیے اچھی خبر تھی۔ حکومت کی فرسٹریشن بڑھ گئی تھی۔ اکّا دکّا گرفتاریاں اور چھاپے بھی شروع ہو گئے تھے۔)"18(

سیاسی ابتری کا عالم یہ تھا کہ ہر جگہ اقتدار میں بڑے خاندانوں کے لوگ اپنے اپنے منصب پر بیٹھ کر غریب عوام اور انصاف طلب ذہنوں کا مذاق اڑا رہے تھے اور اگر کوئی ذہن اس نظام سے اختلاف کرنے کی کوشش کرتا ہوا محسوس ہوتا تو اسے دھر لیا جاتا۔ ناول اس انداز سے ایک اہم موضوع زندگی کو بے نقاب کرنے میں کوشاں ہے۔ جس میں معاشرے کو کسی صورت میں انصاف کی بالا دستی ہوتی ہوئی نہیں دکھائی دے رہی تھی لہٰذا انصاف کی عدم دستیابی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ اب پیدا ہونے والے مسائل کبھی حل نہیں ہوں گے۔ یوں شاہد صدیقی ایک دفعہ پھر اس اہم جملے کو تخلیق کرتا ہے:

"اگر منصف ہی زور آوروں کے دست و بازو بن جائیں تو عام لوگ انصاف کے لیے کہاں جائیں۔)"19(

ایک اور جملہ ملاحظہ ہو:

"سوشل کلاس، نسل اور جنس کی بنیاد پر معاشرے کو تقسیم کر دیا گیا ہے لیکن اس سے بھی بڑی تقسیم زور آوروں اور کمزوروں کی ہے۔)"20(

اس ناول میں واضح ہے کہ شاہد صدیقی کس معاشرے کے طلبگار ہیں اور انھیں کس مزاج کی انسانیت سے لگاؤ ہے۔ عدلیہ بحالی تحریک دراصل سارے معاشرے کی بحالی کی تحریک ہے جس سوسائٹی میں انصاف نہیں ہوتا وہاں کوئی کام بھی اپنی بنیادی حقیقت سے مکمل نہیں ہوتا اگر معاشرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے تو اس لاقانونیت، نامساوی سماجی رویے کے خلاف ذہنوں میں پیدا ہونے والی مزاحمتی آب و ہوا شعور کے روشن دان سے آتی ہوئی زندگی بخش تازگی لاتی ہے جس سے سارا معاشرہ مہک اٹھتا ہے اور برابری مساوات اور اخلاقیات کی تقسیم جگہ بنا لیتی ہے۔ چونکہ برصغیر کی تقسیم اتنا بڑا حادثہ تھی کہ اس نے ہمارا سب کچھ تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ انسان دوستی، بلند اخلاقی قدریں اور ہماری اعلیٰ تہذیبی روایات اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ انتشار کے دور میں عموماً تخلیقی دماغ بانجھ ہو جاتے ہیں اور ادیب عموماً عجیب قسم کی بدحواسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن "آدھے ادھورے خواب" کا مصنف متوازن الطبع ہے اور معاشرے کو ایک کینوس پر پھیلا کر اس کے تمام رنگوں کے نتائج سے باخبر دکھائی دیتا ہے اور اسے علم ہے کہ خواب اور نظریے کی پاسداری کس حد تک یقینی ہونی چاہیئے۔

"خواب اور نظریے کی اہمیت سب سے ارفع محبت ہے جو ہمیں باقی تمام محبتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے یا یوں سمجھ لو کہ پھر اس خواب اور نظریے سے وابستہ لوگوں سے محبت ہو جاتی ہے، محبت قربانی مانگتی ہے کبھی مال، کبھی مرتبے کی، کبھی جان کی۔)"(21)

یہ اقتباس پورے ناول کی حقیقی نمائندگی ہے اس میں ادب بھی ہے، سیاست بھی اور وابستگی بھی ہے اور وہ خاص تعلیم بھی جو کسی ادارے کی پاسداری کے لیے از حد ضروری ہوتی ہے۔ تین اہم چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ مال، جان، مرتبہ۔ گویا انسان مکمل طور پر اپنے نظریات کی خاطر ہر شے سے پیچھے ہٹ سکتا ہے لیکن نظریے کے لیے جان، مال اور مرتبہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

حوالہ جات

1۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، " معاصر ادب" ،لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز،1990، ص،33

2۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"،لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2018، ص493

3۔ محمد علی صدیقی، "ادب اور سیاست" مشمولہ "توازن" کراچی،1976، ص13

4۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، " معاصر ادب" ، ص36

5۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، " تنقیدی ادب" ،لاہور،1959ء، ص16

6۔ قاضی جاوید، "والٹئیر"،لاہور، فکشن ہاؤس،2014ء، ص106

7۔ شاہد صدیقی، "آدھے ادھورے خواب" ،لاہور، جہانگیر بکس،2009، ص15

8۔ ایضاً، ص45

9۔ ایضاً، ص64

10۔ ارشد محمود، " کسی نئے میثاق پاکستان کی ضرورت"(کالم) مشمولہ سہ ماہی "آج" نمبر70، جون 2011ء، ص342

11۔ شاہد صدیقی، "آدھے ادھورے خواب" ، ص70

12۔ ایضاً، ص71

13۔ ایضاً، ص90

14۔ ایضاً، ص94

15۔ ایضاً، ص100

16۔ ایضاً، ص101

17۔ ایضاً، ص110

18۔ ایضاً، ص116-117

19۔ ایضاً، ص117

20۔ ایضاً، ص119

21۔ ایضاً، ص126